دعوت اسلامی کی نئی جہتیں

خرم مرادؒ

حرفِ آغاز

جناب خرم جاہ مراد معروف بہ خرم مرادؒ (۱۹۳۲-۱۹۹۶) اسلامی دنیا کے نامور دانش ور اور تحریک اسلامی کے عظیم رہ نما تھے۔ گہرائی فکر، بلندیٔ خیال اور سوز و دردمندی ان کی تقریروں اور تحریروں کی اہم خصوصیات تھیں۔

خرم مرادؒ غیر منقسم ہندستان کے مردم خیز شہر بھوپال میں پیدا ہوئے۔ وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۵۲ میں کراچی یونی ورسٹی سے سول انجینئرنگ میں بی. ای اور ۱۹۵۸ میں یونی ورسٹی آف مِنی سوٹا امریکہ سے ممتاز نمبروں کے ساتھ ایم. ایس کی ڈگریاں حاصل کیں۔ وہ ایک ممتاز انجینئر تھے اور مشہور مشاورتی فرم ایسوسی ایٹڈ کنسٹنگ انجینئرز میں چیف انجینئر اور ڈائریکٹر کے طور پر ڈھاکہ، ایران اور سعودی عرب میں انہوں نے ایک مدت تک پیشہ ورانہ خدمات انجام دیں۔ انہیں اس بات کا بھی شرف حاصل رہا ہے کہ وہ مکہ مکرمہ میں مسجد حرام کی تعمیر نو میں بھی شریک رہے۔

خرم مرادؒ بہت کم عمری میں تحریک اسلامی سے وابستہ ہوئے، ۱۹۵۱-۱۹۵۲ میں اسلامی جمعیت الطلبہ کے ناظم اعلیٰ، ۱۹۶۳ سے ۱۹۷۰ تک جماعت اسلامی ڈھاکہ، ۱۹۸۷ سے ۱۹۸۹ تک جماعت اسلامی لاہور کے امیر رہے اور آخری برسوں میں جماعت اسلامی کے نائب امیر کی حیثیت سے دعوت دین کی خدمت انجام دی۔ ۱۹۷۷ سے ۱۹۸۷ تک انگلستان کے مشہور علمی ادارے اسلامک فاونڈیشن لیسٹر کے ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ مسلم ورلڈ بک ریویو لیسٹر اور ماہ نامہ ترجمان القرآن لاہور کے ایڈیٹر بھی رہے۔

خرم مراد کی اردو میں کم و بیش پچاس اور انگریزی میں تیس چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ دروس اور خطابات ان کے علاوہ ہیں۔

زیر نظر کتاب ''دعوت اسلامی کی نئی جہتیں'' خرم مراد کی کوئی مستقل کتاب نہیں، بلکہ یہ ان کی ایک تقریر ہے، جسے کتابی شکل میں پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ اس میں خرم مراد نے بڑی تفصیل اور دل سوزی کے ساتھ بتایا ہے کہ اجتماعی تحریکیں، جن عظیم مقاصد کو لے کر اٹھتی ہیں، کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد ان مقاصد کا شعور دھندلانے لگتا ہے۔ وقتی اور ہنگامی نوعیت کی سرگرمیاں، وسائل کا زیادہ حصہ اپنے لیے صرف کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ ایک کامیاب داعی کا فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے تقاضوں اور چیلنجوں پر اجتہادی نگاہ ڈالتے ہوئے تحریک کو آگے بڑھانے کی فکر کرے۔

ناشر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دعوت اسلامی کی نئی جہتیں

ہماری دعوت ایک ازلی اور ابدی دعوت ہے۔ یہ اتنی قدیم تو ضرور ہے کہ جب لوح محفوظ پر اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور اس کی کتاب محفوظ کر دی گئی۔ اور ہمارے لیے اس لحاظ سے بھی قدیم ہے کہ اس ہدایت کا آخری پیغام خدا کے آخری نبی سرور کائنات، محمد رسول اللہ ﷺ پر آج سے ۱۴ سو سال قبل نازل ہوا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ دعوت کی نئی جہت سے کیا مراد ہے؟ چند غور طلب پہلو حسب ذیل ہیں:

دعوت کا عمل چند عناصر پر مشتمل ہے۔ اس میں خود دعوت کا موضوع اور اس کا مبحث بھی شامل ہے جو ازل سے ایک ہی رہا ہے۔ خدا کا ہر نبی ایک ہی دعوت لے کر آیا۔ اِنَّنِیۡۤ اَنَا اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدۡنِیۡ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ ۝ (طٰہٰ: ۱۴) میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے، پس تو میری بندگی کر اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر... البتہ اس دعوت کے اجزا ایک سے زیادہ رہے ہیں۔ ان اجزا کے درمیان تقدیم اور تاخیر بھی ہوئی ہے اور ترجیحات کا نظام بھی بدلتا رہا ہے۔ تاہم کبھی کسی پر زور کم دیا گیا اور کبھی تاکید زیادہ ہوئی۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر دعوت کی نئی جہت کیا ہوئی؟

دعوت کا اسلوب

اگرچہ ہر زمانے، معاشرے اور مخاطب کے حوالے سے اسلوب دعوت اور زبان میں فرق واقع ہوتا گیا۔ ہر نبی ایک ہی دعوت لے کر آیا۔ تاہم اس نے اپنے معاشرے اور قوم سے اس کی روایات، تاریخ، ثقافت، حالات، اور اس کی زبان میں بات کی۔ اس کے عقائد کے حوالے سے کلام کیا۔ اس لحاظ سے کبھی عبودیت الٰہی کی دعوت کے ساتھ بلند و بالا عمارتیں تعمیر کرنے کے خلاف نکیر کی گئی اور کبھی استعماری (امپیریلسٹ) طاقت بن کر دنیا کی کمزور قوموں کو دبانے کے خلاف آواز بلند کی گئی۔ کبھی جنسی رَویوں میں بے اعتدالی پر متنبہ کیا گیا اور کبھی معاشی معاملات میں، عدل وانصاف سے ہٹنے کی روش بدلنے کی دعوت دی گئی، یا کبھی وقت کے فرعونوں کے دربار میں کھڑے ہو کر اپنی قوم کی آزادی کا مطالبہ کیا گیا۔ کبھی بگڑی ہوئی مسلمان قوم کے عقائد، اعمال اور خدا کی طرف سے سپرد کردہ مشن میں ان کی کوتاہیوں پر انہیں پکارا گیا اور اصلاح کی طرف متوجہ کیا گیا۔ آج اگر آدمی نئی جہت کی تلاش کرے تو یہ سوچے گا کہ اس لحاظ سے تقدیم اور تاخیر، تاکید اور زور، اور ترجیحات میں کیا کوئی نئی روش یا نئے افق ہمارے سامنے آسکتے ہیں۔

دعوت کا مقام

دعوت لانے والوں کے نزدیک ہمیشہ دعوت کا مقام ایک ہی رہا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کے آنے کا مقصد اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف بلانا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کو جمع کرنا، ان کو ایک قوت بنانا، اس قوت کے ذریعے بدی کے خلاف جہاد کرنا، فساد اور ظلم کو مٹا کر اس کی جگہ حق، فلاح اور انصاف قائم کرنا، یہ کام بھی انہوں نے سرانجام دیے۔ آج اگر کوئی دعوت کی جہت کا تعین کرنا چاہے گا تو اس کو یہ بھی غور کرنا پڑے گا کہ ان میں سے کس چیز کا کیا حصہ، کیا مقام اور کیا ترجیح ہے؟

داعی

دعوت کے عمل کا ایک عنصر داعی خود ہے۔ جن داعیان حق کا اسوہ ہمارے لیے قابل تقلید اور رہنمائی کی روشنی فراہم کرنے والا ہے، وہ خود براہ راست اپنے رب کی نگرانی اور رہنمائی میں دعوت کا کام کرتے رہے۔ ان کے بعد آنے والے لوگ جن کو یہی کام سپرد کیا گیا، ان میں بہت سے جانباز اور قدسی نفوس کی عظمت کا اندازہ لگانا کسی کے بس میں نہیں، اور اس قافلہ حق میں ہم جیسے، کمزور اور زمین کا بوجھ بھی رہے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کمزور اور ناکارہ لوگ اگر دعوت کا کام کریں تو کس جہت سے کریں؟

دعوت کا مخاطب

دعوت کے عمل میں ایک عنصر دعوت کا مخاطب بھی ہے۔ دعوت کا ہر مخاطب اگرچہ ایک انسان ہے، لیکن اپنے مزاج، سوچ اور عزائم کے حوالے سے وہ ایک مختلف شے ہے۔ کوئی دو انسان ایک جیسے نہیں، اور نہ ان کو ایک ہی طرح دعوت پہنچائی جاسکتی ہے۔ اس لیے کہ ہر انسان کا ماحول، تعلیم و تربیت، مزاج اور سوچ مختلف ہوتی ہے۔ ماحول میں، معاشرے میں اور زمانے میں بھی تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے، جس سے لازمی طور پر مخاطب متاثر ہوتا ہے۔

آج اس صدی کے مخاطب فرد سے، جو چاروں طرف سے دنیا کی مختلف قوتوں کی زد میں ہے، جس کے ذہن، سوچ، افکار، لباس اور رہن سہن کی تشکیل ایک بے خدا تہذیب کے زیر سایہ ہو رہی ہے، اس کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اسلامی دعوت کے لیے کیا اسلوب وضع کر سکتے ہیں اور کیا جہت اختیار کر سکتے ہیں؟ یہ بات بھی غور طلب ہے۔

طریق دعوت

دعوت کا ایک عنصر خود طریق دعوت ہے۔ کیا روش، کیا رویہ اور کیا طرز عمل ہے جو حکمت کے مطابق ہوگا؟ پہلے چار عناصر سے مل کر ہی اس سوال کا جواب ملے گا۔

میں نے دعوت کی نئی جہتوں کے حوالے سے بہت سے سوالات اٹھادیے ہیں۔ ان سب کا جواب کسی ایک گفتگو میں سمیٹنا ممکن نہیں۔ البتہ چند باتیں اہم ہیں جو آج داعیان حق کے سامنے رہنی چاہییں، جو ان کی توجہ اور غور وفکر کا مرکز ہونا چاہییں اور جن کی روشنی میں انہیں سوچنا چاہیے کہ ان کا طرزِ عمل دعوت کے بارے میں کیا ہو۔

ترجیحات میں دعوت کا مقام

سب سے پہلی چیز دین کے پورے نظام میں دعوت کا مقام اور اس کی ترجیح کا مسئلہ ہے۔ بہ ظاہر یہ ایک بڑا آسان سوال ہے، لیکن جو بھی ہمارے دینی لٹریچر سے واقف ہے وہ جانتا ہے کہ اس پر بڑی طویل بحثیں اور گفتگوئیں ہوئی ہیں اور یہ بحثیں ہمارے لٹریچر میں موجود ہیں۔ سفر کے آغاز کی طرح اس کا مقام اور اس کی ترجیح اسی طرح برقرار رہتی ہے جس طرح کہ شروع میں تھی، تو یہ سوال کوئی اہمیت نہ رکھتا۔ لیکن میری رائے میں دعوت کے پھیلاؤ اور تنظیم کی مضبوطی کے ساتھ ساتھ، کاموں کی تعداد اور ان کی نوعیت میں اضافہ فطری امر ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ جو کام آج کرنا ہے یا جو کام فوری توجہ کا محتاج ہے وہی کام وقت، وسائل اور توجہ میں اولین مقام پاتا ہے۔ جس چیز کے بارے میں خوب سوچ سمجھ کر ایک فیصلہ دستور میں لکھا ہوا ہوتا ہے، کہ یہ سب سے اولین ترجیح ہے، اسے اپنے منصوبوں میں قرار واقعی مقام دیا جاتا ہے۔ مگر جب وقت کا دھارا بہتا ہے تو وہ ترجیح عموماً پیچھے چلی جاتی ہے۔ اسی لیے یہ سوال اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ سب سے پہلے اس موضوع پر کچھ باتیں عرض کروں گا۔

دعوت کا لفظ جب ہم بولتے ہیں تو اس کا ایک وسیع مفہوم ہے۔ جس میں اپنے نفس کو نیکی کی دعوت دینا، اور دوسروں کو نیکی کی طرف بلانا بھی شامل ہے۔ جو اپنے آپ کو بھول جائے اور خود کو دعوت نہ دے اور خود کو نہ پکارے اور نہ بلائے اور نفس کو نہ اکسائے کہ وہ صحیح راہ پر آئے اور صرف دوسروں ہی کے سامنے وعظ کرتا پھرے، تو ان کے اوپر قرآن مجید کی یہ آیت صادق آتی ہے:

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ. (البقرہ: ۴۴)

تم دوسروں کو تو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے لیے کہتے ہو، مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟

دعوت کے طریقوں کے اندر قول اور عمل دونوں شامل ہیں۔ اس لحاظ سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو شاید دعوت کے دائرے سے باہر ہو۔ دعوت کا عمل انفرادی طور پر بھی ہوسکتا ہے اور اجتماعی طور پر بھی۔

ہم یہاں اختصار کی خاطر دعوت سے مراد صرف وہ حصہ لیں گے، جس کا مقصد دوسروں کو اللہ کی طرف بلانا، اللہ سے جوڑنا اور اللہ سے ملاقات کے لیے تیاری کرنے پر آمادہ کرنا ہے۔ نیز زندگی میں وہ روش، وہ طرز عمل اور وہ اخلاق اختیار کرنا جو اللہ کو محبوب ہے۔ جس کی محبوبیت پر میں نے انبیا علیہم السلام کی معرفت مہر تصدیق ثبت کی ہے۔ اس لحاظ سے اگر آپ غور سے جس پہلو کو بھی دیکھیں تو اندازہ لگائیں گے کہ دعوت، بہت سارے کاموں میں سے ایک کام، بہت سارے مقاصد میں سے ایک مقصد اور بہت ساری ترجیحات میں سے ایک قابل ترجیح شے نہیں ہے بلکہ دراصل ایک مسلمان کی مسلمانیت کا یہی باعث، یہی مقصد اور یہی وجہ جواز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب اپنے نبی اور رسول بھیجے تو انہوں نے اپنی زندگی میں بہت سارے کام کیے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے آخر تک ایک ہی لقب سب سے زیادہ پسند کیا، اور وہ لقب تھا ''رسول''۔ رسول کے معنی، پہنچانے والا، دعوت دینے والا اور داعی کے ہیں۔ اور جب رسولؐ سے خطاب کیا تو یہی فرمایا:

يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝ (الاحزاب: ۴۵، ۴۶)

اے نبیؐ، ہم نے تمھیں بھیجا ہے گواہ بنا کر، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر، اللہ کی اجازت سے اس کی طرف دعوت دینے والا بنا کر اور روشن چراغ بنا کر۔

حیات رسالت مآب ﷺ کے جس پہلو کی طرف بھی نظر ڈال کر دیکھیے، وہ دعوت کا کام ہے۔ گویا رسالت کا بنیادی فریضہ ہی یہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صاف صاف فرما دیا ہے کہ جو کچھ بھی تم کو دیا گیا ہے، اس کو پہنچاؤ۔ اور اگر تم نے نہیں پہنچایا، یہ کام نہیں کیا، تو پھر تم نے اس کے پیغام کو پہنچانے کا حق ادا نہیں کیا۔

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ (المائدہ:۶۷)

اے پیغمبرؐ، جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچادو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا۔

اگر آپ تحریک اسلامی کی وجہ جواز پر غور کریں تو دیکھیں گے کہ تحریک، کار دعوت کے علاوہ اور کوئی مقصد اپنے سامنے رکھ ہی نہیں سکتی۔ یہ دعوت کے لیے وجود میں آئی ہے، ہر چیز اسی لیے ہے۔ یہ تنظیم، یہ اجتماعات اور یہ ساری سرگرمیاں بھی اسی لیے ہیں کہ اللہ کی بات اللہ کے بندوں تک پہنچے۔

اگر اللہ کے سامنے جواب دہی اور مسئولیت ہے، اور یقیناً ہے، تو وہ یوم عدل یہ سوال نہیں کرے گا کہ تم نے اسلامی نظام قائم کیا یا نہیں کیا؟ شریعت نافذ کی یا نہیں کی؟ حکومت الٰہیہ بنائی یا نہیں بنائی؟ اسلامی ریاست وجود میں لائے یا نہ لائے؟ لیکن جن کو بھیجا ہے ان سے ہم یہ ضرور پوچھیں گے کہ تم نے ہمارے پیغام کو پہنچانے کا حق کہاں تک ادا کیا؟ فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۙ (الاعراف:۶) ''پس یہ ضرور ہو کر رہنا ہے کہ ہم ان لوگوں سے باز پرس کریں جن کی طرف ہم نے پیغمبر بھیجے ہیں اور پیغمبروں سے بھی پوچھیں۔'' (کہ انہوں نے پیغام رسانی کا فرض کہاں تک انجام دیا اور انہیں اس کا کیا جواب ملا)... نبی کریم ﷺ نے بھی آخری شہادت اسی بات کی دی تھی کہ میں نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا اور تبلیغ کردی۔ مطلب یہ کہ تحریک اسلامی کا اور اس کی سرگرمیوں کا اس کے سوا کوئی جواز نہیں ہے کہ وہ دعوت کا پیغام دوسروں تک پہنچائے۔

طریق دعوت: چند غور طلب پہلو

دعوت کی مسلمہ اہمیت کے پیش نظر طریق دعوت نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ مگر دعوت، توسیع دعوت اور موثر دعوت کے حوالے سے کئی غلط فہمیاں اور مغالطے پائے جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ آپ کے سامنے رکھوں اور ان پر بھی مختصر گفتگو کروں۔

فرد سے رابطہ

ایک مغالطہ یہ ہے کہ ”دعوت کا کام دراصل فرد اور فرد کے درمیان ایک طویل رابطے کا کام ہے۔“ دعوت کا کوئی بھی کام جس میں بڑے بڑے اجتماعات کا انعقاد، یا بڑے بڑے گروہوں کو، یا پوری کی پوری قوموں کو مخاطب کرنا شامل ہے، دراصل ذہن کے اندر دعوت کا بیج ڈالنے کے مترادف ہے۔ انبیاء کرام کا اسوہ یہ بتاتا ہے کہ ایک ایک فرد تک پہنچ کر دعوت دینا اور اس سے رابطہ رکھنا، دعوت کا صرف ایک پہلو تھا اور وہ بھی بالکل ابتدائی دور میں۔ لیکن جیسے ہی اللہ نے اپنے نبی کو یہ حکم دیا اب تم سب تک دعوت پہنچاؤ تو پھر اس دعوت کی پکار صفا کی پہاڑی سے بھی بلند ہوئی اور اس دعوت کے لیے گھر میں سرداروں کو دعوت پر بھی جمع کیا گیا۔ اس دعوت کے لیے عکاظ کے میلے میں کارنر میٹنگز بھی ہوئیں، جہاں جگہ جگہ کھڑے ہو کر یہی خطاب ہوا، اور دعوت حق کے یہی بیج بکھیرے جاتے رہے تا کہ جس کے کان میں پڑ جائے، جس کے دل میں جڑ پکڑ لے، جو اس کو قبول کر لے، فبھا اور جو نہ قبول کرے تو یہ اس کی اپنی ناکامی ہے۔ دعوت کی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو محدود نہیں کر سکتی۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ دعوت کا کام محض ایک ایک فرد کے ساتھ ربط رکھنے ہی سے ہو سکتا ہے، میرے خیال میں وہ انبیائے کرام کے طریقۂ دعوت کو سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں۔

توسیع اور استحکام

ایک مغالطہ یہ بھی ہے کہ ”دعوت کا کام استحکام کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے۔ جتنی دعوت پھیلے، اتنا ہی استحکام ہو یا جتنا استحکام ہو اتنی ہی دعوت پھیلائی جائے، ورنہ بے شک دعوتی کام رکتا ہے تو رک جائے۔“ یہ بات بھی انبیاء کرام علیہم السلام کے اسوہ سے ظاہر نہیں ہوتی۔ جان لینا چاہیے کہ استحکام، دعوت سے ایک الگ مقصد ہے۔ دعوت کا مقصد استحکام نہیں ہے بلکہ دعوت کا مقصد تو یہ ہے کہ اللہ نے اپنے پیغام کی جو امانت سپرد کی ہے، جس امانت پر آدمی کی نجات کا انحصار ہے، وہ امانت ہر انسان تک پہنچنا چاہیے۔ اس دعوت کو ماننا یا نہ ماننا، اس کے پیچھے چلنا یا

اس کو قبول نہ کرنا، یہ اس فرد کا اپنا فیصلہ ہے۔ لیکن ایک داعی استحکام کے انتظار میں دعوت کے کام کو ترک کر کے نہیں بیٹھ سکتا۔

دعوت اور تربیت میں توازن

ایک مغالطہ دعوت اور تربیت کے درمیان توازن کا اٹھتا ہے کہ "تربیت کم ہورہی ہے، دعوت زیادہ پھیل رہی ہے اور یہ ایک خطرناک علامت ہے۔" حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ ہماری تحریک کی بنیاد میں یہ بات شامل ہے کہ تربیت کا سب سے پہلا اور سب سے موثر ذریعہ دعوت ہی ہے۔ سید مودودیؒ کے یہ الفاظ ان کی بہت ابتدائی تقریروں کے اندر موجود ہیں کہ ہماری تربیت کا طریقہ، فطری طریقہ ہے۔ اس طریقے کی بنیاد اس بات پر ہے کہ آدمی دعوت کو لے کر کھڑا ہو جائے۔ جب وہ دعوت کو لے کر کھڑا ہو جائے گا تو معاشرہ اور ماحول اور دعوت کا کام خود ہی اس کی تربیت کرتے چلے جائیں گے۔

داعی کے کردار کا معیار

دعوت کے معاملے میں ایک مغالطہ داعی کے کردار کا بھی پیدا ہوتا ہے۔ عرصے سے یہ بات چلی آرہی ہے، غالباً دور صحابہؓ سے یہ مسئلہ موجود رہا ہے کہ اگر داعی کا اپنا کردار ابھی کسی معیار پر نہیں پہنچا تو کیا وہ دعوت کا کام کر سکتا ہے؟

اس مسئلے پر بہت تفصیل سے امام غزالیؒ نے اپنی کتاب احیاء العلوم میں "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کے تحت بحث کی ہے۔ مختصراً دو جملوں میں انہوں نے پورا مسئلہ یوں حل کیا ہے۔ وہ ایک سوال اٹھاتے ہیں: کیا ایک فاسق آدمی کو جو خود شراب پیتا ہو، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کرنا چاہیے؟ کیا کسی دوسرے کو شراب سے روکنا اس کے لیے جائز اور صحیح ہے؟ وہ اس سوال پر تفصیلی بحث کرتے ہیں، پھر اس کے بعد کہتے ہیں: آدمی کے لیے دو حکم ہیں: ایک حکم یہ ہے کہ وہ شراب نہ پیئے۔ یہ اپنی جگہ پر ایک علیحدہ حکم ہے۔ اور ایک حکم یہ ہے کہ وہ دوسروں کو

شراب پینے سے روکے۔ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ (لقمٰن:۱۷) نیکی کا حکم دے، بدی سے منع کر... یہ ایک دوسرا حکم ہے۔ ایک حکم کی تعمیل نہ کرنے سے دوسرے حکم کی تعمیل نہ کرنے کا جواز نہیں پیدا ہوسکتا۔ اگر آدمی روزہ نہیں رکھتا تو نماز بھی نہ پڑھے، یہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ کوئی آدمی روزہ نہیں رکھتا، تو وہ حج بھی نہ کرے، یہ بھی کوئی آدمی نہیں کہہ سکتا۔ ممکن ہے اس کی بات قبول نہ ہو، اس کی بات میں اثر نہ ہو، لوگ یہ کہیں کہ تم ہم کو کیسے کہنے کے لیے کھڑے ہوگئے، جب کہ تم خود شراب پیتے ہو۔ درحقیقت دونوں فرض اپنی جگہ پر علیحدہ علیحدہ ہیں اور ایک فرض پر عمل نہ کرنے سے دوسرا فرض ساقط نہیں ہوسکتا۔

صلاحیت اور استعداد کی کمی

ایک مغالطہ اپنی صلاحیت کا بھی پیدا ہوتا ہے کہ آج کے زمانے میں پیچیدہ مسائل ہیں جن کے حوالے سے طرح طرح کی بحثیں اٹھتی ہیں۔ جب تک ہمارے اندر اتنا علم نہ ہو، اتنی صلاحیت نہ ہو، اتنی استعداد نہ ہو کہ اس چیلنج کا کماحقہٗ جواب دے سکیں، اس وقت تک ہم دعوت کا کام بھلا کیسے کرسکتے ہیں؟ اس کا جواب اس حدیث میں بہت واضح طور پر آگیا ہے: بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ كَانَ آيَةً۔ یعنی ایک آیت بھی تم کو معلوم ہے، تم جانتے ہو، تو اس کو پہنچاؤ۔ یہ نہیں کہ پہلے فلسفہ اور سارے علوم سے واقف ہوجاؤ، پھر تم دعوت کا کام کرسکتے ہو۔

دعوت کے کام میں عجلت

اسی طرح ایک اور مغالطہ یہ ہے کہ دعوت کا کام سست روی کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم جما کر اور کام کو مستحکم کرتے ہوئے کرنا چاہیے۔ اس میں عجلت نہیں کرنی چاہیے۔ یہ تاثر بھی پایا جاتا ہے کہ کسی ایک ملک میں بھی اسلامی نظام کامیاب نہیں ہوسکتا یا اسلامی انقلاب نہیں آسکتا جب تک بین الاقوامی رائے عامہ تیار نہ ہو، یا جب تک کہ اربوں آدمی ہماری دعوت سے واقف نہ ہوں، اور کروڑوں آدمی اس کی حمایت کے لیے تیار نہ ہوں۔ جو تبدیلی ہمارے پیش نظر ہے یہ اس

کے طریقۂ کار کا تقاضا ہے۔ اس کے لیے ہم استحکام چاہتے ہیں، تنظیم چاہتے ہیں، تربیت چاہتے ہیں اور کھرے اور پختہ کار لوگوں کا گروہ چاہتے ہیں۔ لیکن اس سب کا مقصد کیا ہے؟ یہی کہ نظام فاسق کی جگہ نظام حق قائم ہو۔ یہ نظام حق قائم ہوتا ہے، اللہ کی نصرت اور اسلام پر عمل کرنے والے صالح انسانوں کے ذریعے۔ یہ وہ دو وسائل ہیں جن سے بالآخر فتح نصیب ہوگی۔

هُوَ الَّذِيٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (الانفال: ۶۲)

وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں کے ذریعے سے تمہاری تائید کی۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

(الانفال: ۶۴)

اے نبیؐ، تمہارے لیے اور تمہارے پیرو اہل ایمان کے لیے تو بس اللہ کافی ہے۔

یہ بات غور طلب ہے کہ مومنین کی یہ جماعت جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ کیا ہے، کس طرح جمع ہوئی اور نبی کریم ﷺ نے کن کن طریقوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کے لوگوں کو نکالا۔ لوگوں کے دلوں کو پگھلانے، ان کو مسخر کرنے اور ان کو ایک عالمی انقلاب کے لیے کھڑا کرنے کے لیے آپؐ نے کیا اقدامات فرمائے۔ اس گروہ انسانی کو ایک قوت بنانے کے لیے آپؐ نے کون سے طریقے اختیار کیے کہ جس کے نتیجے میں اس قوت نے سو سال کے عرصے میں اسپین سے لے کر چین کے ساحل تک واقعی ایک عالمی اسلامی انقلاب برپا کر دیا۔ اس کے لیے آپؐ نے جو تدابیر اختیار کیں اور جس طرح لوگوں کو اپنے ساتھ ملایا، یہ ایک الگ باب ہے جس کا میں مختصراً تذکرہ کروں گا۔

دعوت کے طریقۂ کار اور اس کی نوعیت کا تقاضا ہے کہ یہ دعوت جتنی عام ہو سکے، اس کو اتنا عام ہونا چاہیے۔ ایک داعی حق، جہاں، جس طرح اور جس سے بھی معاملہ کرے اس میں دعوت کا پہلو سب سے زیادہ غالب ہونا چاہیے۔ سارے کام اسی محور کے گرد گھومنے چاہییں۔ اوقات، توجہات، ترجیحات، مالی اور مادی وسائل، اخلاقی اور روحانی وسائل، سب کاموں سے بڑھ کر اسی کام پر صرف ہونے چاہییں ورنہ دعوت سے منسوب تحریک ایک مدت گزرنے کے بعد دریا بننے کے بجائے خاک کا رزق بن جائے گی۔

یہ سوال بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ داعی کی اپنی سوچ، طریقۂ کار، حکمت عملی اور تدابیر کے حوالے سے وہ بنیادی باتیں کیا ہیں جو آج کے دور میں ہمارے سامنے رہنا چاہییں۔

ہر فرد ایک ممکنہ ساتھی

پہلی بنیادی بات جو دراصل سارے دین کی اور دعوت دین کی بنیاد ہے، وہ یہ ہے کہ ہر وہ انسان جس نے سوچ سمجھ کر دعوت کو مسترد نہیں کر دیا، وہ ایک ممکنہ ساتھی ہے۔ ایک قیمتی اثاثہ یا potential حلیف ہے۔ وہ ہمارا ساتھی بن سکتا ہے اگرچہ وہ دشمن ہو، اور کتنی ہی دشمنی پر اس نے کمر باندھ رکھی ہو۔ جس کو اللہ نے سوچنے کے لیے دل دیا ہے، دیکھنے کے لیے آنکھیں دی ہیں، سننے کے لیے کان دیے ہیں، جس نے اپنے کانوں پر اور دل پر مہر نہیں لگائی، جس نے اپنی آنکھوں پر پردہ نہیں ڈالا، جس نے اپنے آگے اور پیچھے دیوار نہیں کھڑی کر دی، ہمیشہ اس بات کا امکان موجود ہے کہ وہ حق کی دعوت کو قبول کر لے۔

حضرت عمرؓ بن الخطاب جیسے مخالف، تشدد اور مار پیٹ کرنے والے، کمزوروں کا گلہ دبانے والے کے بارے میں جب یہ امید کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو دین کے دائرے میں لائے گا اور ان کے ذریعے دین اسلام کو تقویت دے گا، تو پھر دیگر لوگوں سے کیوں یہ امید نہیں کی جا سکتی۔ بے شک ابوجہل اور ابولہب کو یہ سعادت نصیب نہ ہوئی۔ مگر عمروؓ بن العاص، ابوسفیانؓ، مغیرہؓ بن شعبہ کے ساتھ قریش کے اور ثقیف کے ان بے شمار لوگوں اور قبائل کے ان سرداروں کو دیکھیے جو دعوت کے ۲۳ برسوں میں سے ۲۱ سال تک معمولی درجے کے نہیں بلکہ نہایت سخت مخالف رہے، لیکن بالآخر وہ بھی اسی دعوت حق کی آغوش میں آ گئے۔ اور ان سب کے آنے ہی سے وہ قوت بنی جس نے آخر کار دنیا کو مسخر کیا۔

اگر مدینہ منورہ ان چند پاکیزہ نفوس پر مشتمل رہتا اور محض ایک خانقاہ یا مدرسہ بنا رہتا تو مدینہ کا انقلاب اسپین سے چین تک نہیں پھیل سکتا تھا۔ لیکن مدینہ ایک خانقاہ نہ تھی، مدینہ ایک مدرسہ نہیں تھا، مدینہ نے صرف چند پاکیزہ نفوس جمع کر لینے کو اپنا کام نہیں سمجھا تھا، بلکہ ہر طرح کے

لوگ آئے، ہر قسم کے لوگوں نے لبیک کہا، بڑے بڑے پرانے دشمن آئے، وہ بھی آئے جو مال غنیمت کے لالچ میں آئے، وہ بھی آئے جنہوں نے آکر اونٹ اور خزانے اور پیسہ مانگا، وہ بھی آئے جو دربار نبوتؐ سے سونا اور چاندی لے کر گئے اور وہ بھی آئے جو اپنی قبائلی عصبیت وامتیاز پر فخر کرتے، اس کے رجز پڑھتے اور گیت گاتے ہوئے آئے، سبحان اللّٰہ! ان سب کو رحمت للعالمینؐ کی آغوش رحمت نے اپنے اندر سمیٹ لیا اور سب کو جمع کر کے ایک ناقابل تسخیر قوت بنادیا۔

انسان تو سونا چاندی کی کان اور معادن کی طرح ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس کے اندر سونے چاندی کی صلاحیتیں ہیں، وہ جاہلیت میں قیادت کررہا ہو یا اسلام میں قیادت کررہا ہو، دونوں جگہ یکساں طور پر کام کرے گا۔ جو تم میں جاہلیت میں قائد ہیں اور بہتر ہیں وہی اسلام میں آکر قیادت اور اپنی صلاحیت سے اسلام کو فائدہ پہنچائیں گے۔ خیارکم فی الجاهلية خیارکم فی الاسلام۔

تحریک اسلامی کا مقصد بھی واضح ہے۔ ہمارا مقصود، کوئی مدرسہ یا کوئی خانقاہ بنانا نہیں ہے بلکہ وہ تحریک بنانا ہے جو ان بکھرے ہوئے قیمتی قطروں کو ایک دریا بنادے، ایسا دریا جو سارے عالم کو پیغام الٰہی سے سیراب کرسکے۔ اس حقیقت کو ذہن نشین کرلیا جائے تو ہر انسان ہمارا ممکنہ ساتھی ہے۔ بلکہ وہ لوگ جو جاہلیت میں پیش پیش ہیں، وہی لوگ اسلام میں آکر قیادت میں پیش پیش ہوسکتے ہیں۔

اس بات کا تقاضا ہے کہ جو جتنا آجائے اس کو اتنا قبول کرلیا جائے۔ جب وہ قدم بڑھاتے ہوئے آجائے تو اس کی آمد کے محرکات سے بحث نہ کی جائے، اور اس کی نیت میں جھانک کر نہ دیکھا جائے۔ اس کے دل کے اندر اتر کر یہ تلاش کرنے کی کوشش نہ کی جائے کہ یہ کیوں آرہا ہے اور کس لیے آرہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر عین تلوار کے نیچے آکر کوئی کہے لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ، تو حکم ہے کہ اس کے اوپر سے تلوار ہٹالی جائے اور اس کو صاحب ایمان لوگوں کے گروہ میں شامل کرلیا جائے۔

حضرت اسامہ بن زیدؓ کے بارے میں روایت ہے کہ ایک کافر سے ان کی لڑائی دست

بدست ہو رہی تھی، بالآخر انہوں نے اس پر قابو پالیا اور وہ ان کی تلوار کے نیچے آگیا۔ سارے قرائن جن کو ہماری زبان میں واقعاتی شہادت (Circumstantial evidence) کہتے ہیں، وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتے تھے کہ یہ کلمہ جاں بچانے کے لیے ہے، یہ کلمہ دل سے نہیں نکلا۔ اس لیے حضرت اسامہؓ نے اپنی تلوار کا وار نہیں روکا اور اس کے دو ٹکڑے کر دیے۔ حضور رحمتؐ کو اس واقعے کی خبر دی گئی۔ راوی بیان کرتا ہے کہ آپؐ کے چہرے پر غصے کی لہر دوڑ گئی۔ آپؐ اپنے چہیتے صحابیؓ سے اس قدر ناراض ہوئے کہ آپؐ کبھی اندر جاتے اور کبھی باہر آتے اور کہتے تھے: اسامہ، تم قیامت کے روز اس کے لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ، کا کیا جواب دو گے؟ اور تم نے اس کے دل میں جھانک کر کیسے دیکھ لیا؟

اسی طرح ایک صحابیؓ نے کہا کہ میرے دشمن نے میرا ایک ہاتھ کاٹ دیا اور اب میرا ایک ہی ہاتھ باقی ہے۔ اور وہ میری تلوار کے نیچے آگیا اور کہتا ہے لا اللہ الا اللّٰہ، کیا میں اس کو چھوڑ دوں؟ آپؐ نے کہا: چھوڑ دو۔ اور اگر تم نے نہیں چھوڑا تو پھر آخرت میں تم اس کی جگہ ہو گے اور وہ تمہاری جگہ۔ تم جہنم میں ہو گے اور وہ جنت میں ہو گا۔

آپ ان سارے وفود کی داستانیں پڑھیے جو صلح حدیبیہ کے بعد مدینہ آتے تھے۔ سیرت کے ذخیروں کے اندر ان کی تفصیل موجود ہے، کہ اس وقت طرح طرح کے اور ہر قسم کے لوگ آئے۔ میں صرف ایک وفد کے احوال مختصراً آپ کے سامنے پیش کروں گا۔

یہ طائف کے قبیلہ ثقیف کا وفد تھا جو تبوک سے رسول اللہؐ کی واپسی کے بعد رمضان ۹ ہجری میں حاضر خدمت ہوا۔ قریش کے بعد یہ عرب کا سب سے بڑا قبیلہ تھا۔ اس کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی اور ساتھ ہی ساتھ جنگ جو اور طاقت ور بھی تھا۔ اس قبیلے نے حضورؐ پر سب سے بڑھ کر زیادتی کی تھی۔ جس کے سرداروں نے آنحضورؐ کی تضحیک اور توہین کی اور تشدد کرنے اور پتھر برسانے سے بھی دریغ نہیں کیا تھا۔ جس کے بارے میں آپؐ نے فرمایا تھا کہ میری زندگی میں اگر سب سے زیادہ سخت دن گزرا ہے تو وہ طائف کا دن تھا۔ فتح مکہ کے بعد آپؐ نے طائف کا محاصرہ کیا۔ آپؐ جدید ترین آلات سے مسلح تھے۔ ادھر سے بمباری ہو رہی تھی جس

سے مسلمانوں کا جانی نقصان بھی ہوا، ان کا بھی ہوا۔ اس کے بعد آپؐ نے ساتھیوں سے مشورہ کیا تو ایک بزرگ آدمی نے جو شاید بڑا سیاست داں ہوگا، مشورہ دیا کہ لومڑی تو اپنے بل میں جا چکی۔ اگر آپؐ اس کو چھوڑ دیں گے تو یہ آپؐ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔ اگر آپؐ شکست دیں گے تو شکست کھانے کے بعد آپؐ کا بھی نقصان ہوگا اور ان کا بھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپؐ محاصرہ اٹھا کر مدینہ واپس چلے گئے۔

چند مہینے کے بعد ثقیف نے محسوس کیا کہ اب عرب کے جزیرے میں ایک کافر قبیلہ یوں الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔ اس احساس کے بعد ان کے سردار عبد یالیل بن عمرو کی قیادت میں ایک وفد رسول اللہؐ کی خدمت میں مدینہ منورہ آیا۔ اب دیکھیے کہ صحابہؓ کی خوشی کا کیا عالم تھا۔ وہ ایک دوسرے پر سبقت لے جا رہے تھے کہ کون جا کر رسول اللہؐ کو یہ خوش خبری سنائے کہ ثقیف کا وفد آیا ہے۔ مغیرہؓ بن شعبہ دوڑے تو ابو بکر صدیقؓ آئے اور انہیں قسم دی کہ تم رک جاؤ میں جا کر حضورؐ کو یہ خوش خبری سناؤں گا۔ حضورؐ کو خوش خبری پہنچی تو آپؐ نے مسجد نبویؐ میں ان کے لیے خیمے نصب کروا دیے۔ جو وفد آتا تھا، اس کے لیے بڑی ضیافت کے سامان ہوتے تھے۔ ان کو تحائف دیے جاتے تھے۔ بعض وفود کے ایک ایک فرد کو خیر سگالی کے جذبے سے ۵/۱ اوقیہ چاندی دی جاتی تھی اور وفد کے لیڈر کو زیادہ چاندی دی جاتی تھی۔ یہ تو ہر وفد کے ساتھ معاملہ تھا۔ لیکن یہ ثقیف کا وفد تھا جس پر آیندہ مسلمانوں کی قوت کا انحصار تھا۔ آپؐ نے ان کی بڑی ضیافت اور مہمان داری کی۔ روز نماز عشاء کے بعد ان کے پاس جا کر بیٹھ جاتے تھے اور بات کیا کرتے تھے۔ اہل طائف نے اسلام قبول کرنے کے لیے شرائط عائد کرنا شروع کر دیں: حضورؐ کیا ہم کو زنا کی اجازت ہوگی؟ حضورؐ کیا ہم سود کھا سکیں گے؟ حضورؐ کیا ہم شراب خوری کر سکیں گے؟ حضورؐ کیا ہمارے معبود ''لات'' کے مجسّمے کو برقرار رہنے دیا جائے گا؟ آپؐ ہم کو ایک دستاویز پر یہ سب کچھ کرنے کی اجازت دے دیجیے، ہم اسلام قبول کر لیتے ہیں۔

آپؐ ان کی سب شرائط منظور کرنے سے انکار کرتے رہے۔ آخر میں انہوں نے کہا اچھا! ہم زکوٰۃ نہیں دیں گے اور جہاد ہم پر سے معاف ہونا چاہیے۔ آپؐ نے کہا ٹھیک ہے، میں

تمہاری یہ دو شرطیں مان لیتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز ہم اور آپ نہیں مان سکتے، صرف حضورؐ ہی مان سکتے تھے، اس لیے کہ آپؐ خود شارع تھے۔ آپؐ نے فرمایا: یہ دو شرطیں میں مان لوں گا، زکوٰۃ مت دینا، جہاد مت کرنا۔ پھر آپؐ نے ایک صحابیؓ سے، جو راوی ہیں، یہ فرمایا کہ یہ مسلمان ہو جائیں گے تو ایک سال میں خود بخود زکوٰۃ بھی دیں گے اور جہاد بھی کریں گے۔ حکمت کے تحت آپؐ نے ان کی شرائط منظور کر لیں اور معاہدہ لکھا گیا۔

ان کا ایک بت تھا، جس کا نام لات تھا۔ اب انہوں نے کہا کہ لات کا کیا بنے گا؟ آپؐ نے کہا: اس کو تو گرایا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ یہ تو نہیں ہوسکتا۔ ہم آپؐ پر ایمان لے آئیں اور پھر جا کر بت کو بھی گرا دیا جائے۔ ہم نہیں گرائیں گے، آپؐ کسی اور کو بھیج دیجیے۔ آپ نے حضرت خالدؓ بن ولید کی سربراہی میں ایک مختصر سی ٹیم روانہ کی، جس میں حضرت مغیرہؓ بن شعبہ بھی تھے۔ انہوں نے جا کر بت گرا دیا۔ اس حالت میں یہ لوگ ایمان لائے۔ یہ وہ قبائل تھے جو گروہ در گروہ ایمان لائے۔ قرآن نے ان کے بارے میں کہا ہے: يَدْخُلُوْنَ فِي دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا۔ یہ تمام لوگ جو برسہا برس تربیت کی کٹھالی سے نہیں گزرے تھے، سب کے سب دامنِ رحمتؐ میں سمائے گئے۔

یہ وہی بات ہے جیسا کہ میں نے کہا کہ ہر آدمی اس دعوت حق میں ہمارا ممکنہ ساتھی ہے، اور ساتھ ملنے والا ہر فرد جہاد کر سکتا ہے۔ یاد رہے کہ عدالت میں گواہی کے لیے عادل ہونا شرط ہے، جہاد کرنے کے لیے اسلام نے کوئی شرط نہیں لگائی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ میدان جنگ میں جو فرد شراب کی حد میں گرفتار ہوا، اس نے بھی کمانڈر کی بیوی سے درخواست کی تھی کہ میری زنجیریں کھول دو تاکہ میں جا کر جہاد کروں، تو حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کی بیوی نے ان کی زنجیریں کھول دیں۔ اس نے جا کر جہاد کیا اور جہاد سے آنے کے بعد پھر خود زنجیریں پہن لیں۔

جو تحریک ایک عالمی انقلاب لانے اور اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے کھڑی ہو، اور جو اپنی سرشت کے اعتبار سے کوئی خانقاہ اور مدرسہ نہ ہو، دعوت کے باب میں اس کی روش اس کے علاوہ کوئی اور ہو نہیں سکتی کہ وہ ہر فرد کو تحریک دعوت اسلامی کا ایک قیمتی اثاثہ Potential اور

ایک کارکن سمجھے۔ اگرچہ وہ کتنا ہی مخالف کیوں نہ ہو، وہ کیسا ہی دشمن ہو، اس نے کتنے ہی مظالم ڈھائے ہوں، سب معاف کردیے جائیں گے۔ انہیں عام معافی دی جائے گی۔ فتح مکہ کے موقع پر، وہ لوگ جنہوں نے بہت زیادہ زیادتیاں کی تھیں، ان میں سے ۹ر کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا تھا کہ یہ خانہ کعبہ کے پردے کے نیچے بھی پائے جائیں تو انہیں نہ چھوڑا جائے۔ مگر اس حکم کے باوجود آپؐ نے ۹ر میں سے ۵ر کو معاف فرمادیا، جب کہ ۴ر افراد مارے گئے۔ جن ۵ر کو آپؐ نے معاف فرمایا تھا، یہ سب برسوں کے دشمن تھے مگر اب انہوں نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ لہٰذا جو شخص جس حالت میں قافلۂ حق سے قدم ملائے، اس دعوت کو قبول کرے، اور جتنا بھی اپنے آپ کو سپرد کردے، اس کو اپنے ساتھ لے کر چلنا چاہیے۔ ایسے افراد کو ساتھ لے کر چلنا، یہ تحریک اور تحریک چلانے والے تربیت یافتہ نفوس کا کمال ہے کہ وہ اس کام کو خوبی سے سرانجام دیں۔ اس کے برعکس اگر وہ اپنے دائرے کے اندر محصور رہیں، تو پھر وہ تحریک کے پروردہ کارکن نہ ہوں گے، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی صوفی کی خانقاہ سے نکلے ہوئے مرید ہوں۔

استعداد اور استطاعت کا لحاظ

دوسری بات جو دعوت میں حضورؐ کے سامنے تھی وہ یہ کہ دین کو آسان کرکے پیش کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ مکہ کی زندگی میں اسلام کا لفظ اس طرح معروف نہیں تھا جس طرح آج ہم بار بار دین اسلام کہتے ہیں۔ یہ لفظ مدینہ میں جانے کے بعد معروف ہوا۔ مکہ کی زندگی میں ایک اور لفظ بولا جاتا تھا، وہ لفظ تھا الیسریٰ۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰیۙ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰیۙ۝ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰیؕ۝ (الیل: ۵-۷)

تو جس نے (راہ خدا میں) مال دیا اور (خدا کی نافرمانی سے) پرہیز کیا، اور بھلائی کو سچ مانا، اس کو ہم آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے۔

گویا ''یسریٰ'' یعنی آسان راستہ، رب کی رضا کا راستہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس لفظ کو

منتخب کر کے قرآن مجید میں جڑ دیا۔ یہ راستہ کوئی مشکل راستہ نہیں ہے، نا قابل عبور راستہ بھی نہیں ہے بلکہ آسان راستہ ہے۔ اس موضوع کے، آسان ہونے کے بہت سے پہلو ہیں لیکن یہاں صرف اشارہ ہی کیا جاسکتا ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ ہر شخص سے اس کی استعداد اور استطاعت کے مطابق معاملہ کرنا، اور دین کی بنیادی باتوں پر کوئی مداہنت برتے بغیر ہر ایک کے سامنے اس طرح دین پیش کرنا کہ اس کو وہ آسانی سے قبول کر لے، مطلوب ہے۔ یسروا ولا تعسروا، آسان کرو تنگ مت کرو۔ بشروا ولا تنفروا، خوش خبری دو متنفر مت کرو۔ دین کے مطالبات اس طرح پیش کرو کہ وہ اس کو آسانی سے قبول کرے۔ نبوتؐ کی ۲۳ سالہ حیات مقدسہ اس پر شاہد ہے۔ قبیلہ ثقیف کی مثال بھی اسی ''تیسر'' کا ایک حصہ ہے۔ اور بھی بہت سارے معاملات میں اس کا جلوہ دیکھا جاسکتا ہے۔

دین کے مطالبات میں تدریج

دعوت دین کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ دین کے مطالبات انسان کے سامنے تدریج کے ساتھ رکھے جائیں۔ سارے کے سارے مطالبات کا بوجھ ایک دم نہ لاد دیا جائے۔ اس لیے کہ جب تک ایمان کے ذریعے آدمی کی تربیت نہ ہوگی، وہ پورا بوجھ نہیں اٹھا سکے گا۔ حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ شراب کی بندش کا حکم تین اقساط میں نازل ہوا۔ پہلی دفعہ کہا گیا کہ شراب کے نقصانات زیادہ ہیں اور فوائد کم۔ دوسری دفعہ کہا گیا کہ نشے کی حالت میں نماز مت پڑھو، اور جب تک یہ احکام نازل ہوئے اس وقت تک غزوہ بدر اور غزوہ احد میں بڑے بڑے صحابہؓ شہید ہو چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے بعض شراب پیا کرتے تھے۔ اس کے بعد حکم آیا کہ اچھا اب رک جاؤ، تو وہ فوراً رک گئے۔ اس حکم کی تعمیل کرنے والے بھی صحابہؓ ہی تھے۔ وہ قرآن مجید کی تربیت سے واقف تھے، ان کے لیے یہ کوئی اجنبی بات نہ تھی۔ غور طلب بات یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ جن کا تفقہ فی الدین بڑے بڑے صحابہؓ سے بھی اونچا تھا وہ فرماتی ہیں کہ اگر پہلی ہی دفعہ لوگوں سے کہا جاتا کہ شراب مت پیو تو لوگ نہ مانتے... وہ لوگ جو مکہ یا مدینہ کی

زندگی میں ساتھ تھے... ان کے بارے میں فرماتی ہیں کہ وہ لوگ نہ مانتے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے شراب کی بندش کا حکم تین اقساط میں جاری فرمایا۔

نبی کریمؐ نے حضرت معاذؓ بن جبل اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو یمن بھیجا اور کہا کہ ایک ترتیب کے ساتھ کام کرنا۔ پہلے ان کو ایمان کی دعوت دینا جب وہ ایمان قبول کرلیں تو پھر ان کو پانچ وقت کی نماز کا بتانا۔ جب نماز پڑھنے لگیں تو پھر زکوٰۃ کا ذکر کرنا۔ پھر آہستہ آہستہ سارے دین کی تعلیم دینا اور اس کے بعد پھر آپؐ نے وہی بات فرمائی: بشروا و لا تنفروا، خوش خبری دینا متنفر نہ کرنا۔ یسروا و لا تعسروا، تم دونوں آسانی پیدا کرنا تنگی مت کرنا۔

جو بھی آتا تھا، جو مانگتا تھا، جو آپؐ کے پاس ہوتا تھا، وہ آپؐ عطا کرتے تھے۔ ایک موقع پر ایک عورت آئی۔ اس نے کہا کہ محمدؐ ہمیں بھی دو۔ آپؐ نے کہا، جتنا جانوروں کا گلہ ہے تم سب لے جاؤ۔ اس نے کہا کہ جو آدمی اتنا فیاض ہے، وہ جھوٹا نہیں ہوسکتا۔ کسی تقریر یا دلیل سے جو بات سمجھ میں نہ آئی، وہ فیاضی سے سمجھ میں آ گئی۔

ایک آدمی نے آ کر آپؐ کی گردن میں چادر ڈال دی، کھینچنا شروع کیا یہاں تک کہ گردن پر نشان پڑ گئے۔ صحابہؓ کو غصہ آیا، مارنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ آپؐ نے کہا، رہنے دو اور مسکراتے رہے۔ اس کے بعد آپؐ کے سامنے کچھ مال آیا، آپؐ نے وہ مال اس کو دے دیا اور رخصت کر دیا۔ یہ اخلاق کریمانہ تھے۔ یہ اکرام تھا مہمانوں کا جو آپؐ کیا کرتے تھے۔

نجران، عرب میں عیسائیوں کا سب سے بڑا علاقہ تھا۔ وہاں سے اتوار کے دن عیسائی مدینہ پہنچے۔ ان کو آپؐ نے مسجد نبویؐ میں اپنے مہمان کی حیثیت سے ٹھہرایا۔ انہوں نے کہا کہ آج تو ہماری عبادت کا دن ہے۔ آپؐ نے کہا کہ مسجد نبویؐ میں عبادت کرلو۔ چنانچہ عیسائیوں نے مسجد نبویؐ میں اپنے مذہب اور طریقے کے مطابق اپنی نماز پڑھی۔

حضورؐ مہمانوں سے اکرام اور فیاضی کا سلوک کیا کرتے تھے۔ ایک صحابیہ حضرت رملہؓ بنت حارثہ تھیں۔ ان کا مکان تو اسی کام کے لیے وقف تھا کہ جو وفد بھی آتا، خواہ اس کی تعداد کم ہوتی یا زیادہ، انہی کے ہاں مہمان ٹھہرایا جاتا۔ وہ ان کے لیے اچھے اچھے کھانے پکاتیں۔ آپؐ ان

کو اپنا پیغام بھی پہنچاتے، پھر خود ہدیے اور تحائف دیا کرتے تھے اور قبول بھی کیا کرتے تھے۔ ایک قبیلے کا سردار آیا۔ اس نے آپؐ کی خدمت میں ایک قبا (گاؤن) پیش کی، جو سندس کی بنی ہوئی تھی۔ سندس ایک ریشمی کپڑا ہے۔ اس قبا پر بہترین کام بنا ہوا تھا۔ اگر چہ آپؐ مردوں کے لیے ریشمی کپڑا ممنوع قرار دے چکے تھے، تاہم مہمان کی خوشی اور دل داری کے لیے خوشی سے قبول کیا۔ آپؐ نے اس کے اوپر کوئی فتویٰ صادر نہیں کیا، بلکہ ہدیہ وصول کرنے کے بعد شکریہ ادا کیا۔ اگر چہ خود استعمال نہیں کیا لیکن لے کر رکھ لیا۔

مال، زمین اور جاگیروں کے فرامین تو بے شمار ہیں جو آپؐ نے جاری کیے۔ جو وفد آتا تھا، تو اس کا علاقہ آپؐ اسی کے لیے لکھ دیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپؐ نے کسی قبیلے کے سردار کو اس کی سرداری سے معزول نہیں فرمایا بلکہ ان کو اپنی جگہ پر برقرار رکھا۔ وہ آتے تھے اور صرف ایک دن کے ہی مومن ہوتے، مگر جاتے وقت اپنی سرداری کے ساتھ واپس جاتے تھے۔ قبیلہ ثقیف سے جو معاہدہ کیا اس کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ ہمارا سردار ہمیشہ ہمارے قبیلے میں سے ہوگا۔ جیسے کوئی آج یہ کہے کہ سندھ کا گورنر ہمیشہ سندھی ہوگا، یا پنجاب کا گورنر پنجابی۔ آپؐ نے اس کو بھی قبول فرمایا۔ یہ باقاعدہ معاہدے میں لکھا گیا اور اس پر دستخط ہوئے۔ یہ تھا دعوت کا، عام دعوت اور ہر ایک تک دعوت پہنچانے کے لیے پالیسی اور رویہ۔ مطلب یہ کہ جو جتنا بچ جائے اتنا بچانا ہے، جو جیسا ہے اس کو لینا ہے، جو جتنا مل سکتا ہے اسے لے کر حق کی قوت بنانا ہے۔

آج کوئی کوتاہ نظر اور کم ظرف آدمی یہ اعتراض بھی کر سکتا ہے کہ آپؐ نے وصال فرمایا ہی تھا کہ قبیلوں کے قبیلوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا، اور اس طرح کے نو وارد لوگ مرتد ہو گئے اور جھگڑے شروع ہو گئے۔ یہ اعتراضات کوئی کم ظرف ہی کر سکتا ہے، لیکن وہ اس بات سے بھی آنکھیں بند نہیں کر سکتا کہ اسی دعوت اور اسی پالیسی کے نتیجے میں بالآخر وہ حیرت انگیز انقلاب آیا جس کی مثال انسانیت کی تاریخ پیش کرنے سے عاجز ہے۔ شہروں اور ملکوں نے اپنے دروازے کھول دیے۔ ایک سیلاب کی طرح اسلام بڑھا۔ ایک طرف بحر اوقیانوس کے ساحل تک پہنچ کر مسلمان کمانڈر نے کہا: اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ اس کے آگے بھی اللہ کی کوئی زمین ہے تو میں

اپنے گھوڑے سمندر میں ڈال دیتا۔ دوسری طرف مسلمان سندھ میں پہنچ گئے۔ اسی طرح چین، کاٹھیاواڑ، گجرات، انڈونیشیا اور ملایشیا تک مسلمان تاجر اور مبلغ پہنچ گئے۔ روایت ہے کہ چین کے شہر کینٹن میں صحابہؓ کی قبریں ہیں۔ یہ سب جگہیں کسی فوج کشی سے نہیں زیر ہوئیں۔ مسلمان جہاں گئے ان کا یہی اعلان تھا، یہی وسعت قلبی تھی، دعوت کی یہی اسپرٹ اور ان کا یہی جذبۂ صادق تھا جس نے بالآخر اسلام کو ایک عالم گیر دین اور ایک عالم گیر انقلاب کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ تنگ نظری، تنگ ظرفی اور تنگ دامنی قوموں اور انسانوں کو قوت نہیں بنا سکتی۔ یہی دراصل دعوت کا اصل پیغام ہے۔

✠✠✠